عبادت اور عبودیت

(۳)

از افادات امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

(مترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

عبدیت کے لحاظ سے لوگوں میں فرقِ مراتب

جب تم پر عبادت کی یہ حقیقت روشن ہو چکی تو ایک نگاہ میں تمہیں یہ بھی بدیہی طور پر محسوس ہو جانا چاہیے کہ اس صفت مطلوب کے حصول میں لوگوں کے درمیان عظیم الشان فرق موجود ہے، اور یہ فرق دراصل ایمان کے فرقِ مراتب کا مظہر یا اس کا دوسرا نام ہے۔ عبودیت کے مقامات اور صفاتِ کمال کے لحاظ سے لوگ دو گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ ایک خواص کا گروہ دوسرا عوام کا گروہ۔ اور اسی بنا پر پروردگارِ عالم کی ربوبیت کا تعلق بھی تمام لوگوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتا بلکہ لازمی طور پر اس میں بھی تنوع اور عموم و خصوص پایا جانا ضروری ہے۔ بلکہ حد یہ ہے کہ توحید خالص اور عبودیت حقیقی کی علمبردار امت بھی شرکِ خفی کے باریک ترین جراثیم سے محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

تعس عبد الدرهم تعس عبد الدينار تعس عبد القطيفة تعس عبد الخميصة تعس وانتكس واذا شيك فلا انتقش اذا اعطى رضي واذا منع سخط۔

ہلاک ہو بندۂ درہم، ہلاک ہو بندۂ دینار، برباد ہو زرِ کمبل کا غلام، تباہ ہو ریشمی چادر کا بندہ، ہلاک ہو وہ اور اوندھے منہ گرے۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو نکلتا نہیں (یعنی مصیبت پر مبتلا اٹھتا ہے) اور جب اسے کچھ دیا جائے تو خوش ہو جاتا ہے اور اگر محروم کر دیا جائے تو سخت بیزار۔

ترجمانِ حقیقت کے ان الفاظ پر غور کرو کہ آپ کس طرح زخارفِ دنیوی کے پیچھے پڑنے والے کو عبد الدرہم اور عبد الدینار وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں اور دعائے بد کے طور پر چند کلمات ارشاد فرماتے ہیں تو ساتھ ہی چند الفاظ میں ایک تمثیلی اسلوبِ بلیغ کے ساتھ اس کی زد پرست فطرت کا مرقع کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی خوشی اور ناخوشی کا مدار حصولِ مال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید بھی انسانی فطرت کی اس کمزوری پر شہادت دیتا ہے۔

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ

(توبہ - ۷)

ان منافقوں میں سے بعض صدقات کی تقسیم کے بارے میں تجھ پر حرف زنانہ اشارے کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انہیں کچھ دیا جاتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر کچھ ان کو نہ دیا جائے تو یکایک جل اٹھتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ان کا خوش ہونا یا ناخوش ہونا اللہ کو چھوڑ کر کسی اور ہی چیز پر منحصر ہے۔ ان لوگوں کا مدار رضامندی اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ ان کی اپنی خواہش اور دنیوی لذتیں ہیں، حالانکہ ایک بندہ کی عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی رضا و عدم رضا کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دے۔ ورنہ وہ عبدیت کے ادعا کے باوجود اس کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وہ زبان سے خدا کا بندہ ہے مگر دل مال کی بندگی کے نیاز سے خالی نہیں۔

یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو کسی ریاست یا کسی حسین صورت یا اسی نوع کی کسی اور ہوائے نفس پر مفتون ہو۔ وہ بھی مال و زر کے پجاری کی طرح اگر اپنی مطلوبہ چیز کو پاتا ہے تو سکون و مسرت میں سرمست ہو جاتا ہے، اور اگر ناکام تشنہ رہ گیا تو اسی کے غم میں گھلتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر مذکورۂ بالا شخص حسبِ ارشادِ نبوی بندۂ سیم و زر ہے تو یہ بھی اپنی محبوب شے کا بندہ اور غلام ٹھیرا۔ کیونکہ بندگی اور غلامی درحقیقت دل کی بندگی و غلامی ہے۔ جو چیز بھی قلب کو اپنا غلام اور اسیر بنا لے، انسان صحیح معنوں میں اسی کا بندہ اور غلام ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے کتنی درخشاں حقیقت کا اظہار کیا جس نے کہا ؎

العبد حرما قنع والحر عبد ما طمع

غلام قانع ہے تو آزاد ہے اور آزاد طامع ہے تو غلام ہے

یہی بات ایک اور شاعر ان لفظوں میں کہتا ہے ؎

اطعت مطامعی فاستعبدتنی ولو انی قنعت لکنت حرًا

میں نے اپنی آرزوؤں کی اطاعت کی اور انھوں نے مجھے اپنا غلام بنا ڈالا اگر میں قناعت اختیار کرتا تو یقیناً آزاد رہتا۔

اہلِ دانش کہا کرتے ہیں کہ طمع گلے کا طوق ہے اور پاؤں کی بیڑی۔ گلے کو طوق سے آزاد کرتے ہی پاؤں کی بیڑی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "لوگو سن لو کہ طمع فقر ہے اور ناامیدی غنا، جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے" (مشکوٰۃ)۔ اور یہ ایک امر واقعہ ہے جس کی ناقابلِ انکار شہادت ہر انسان خود اپنے ہی اندر محسوس کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی جبلت ہی یہ ہے کہ جس شے سے وہ ناامید ہو جاتا ہے اس کی طلب اور لالچ اپنے دل سے نکال دیتا ہے، پھر نہ تو وہ اس کی طرف نگاہِ احتیاج اٹھاتا ہے نہ ہی اس سلسلہ میں کسی معین و مددگار کی طرف۔ بخلاف اس کے، اگر وہ کسی معاملہ میں پرامید ہوتا ہے اور اس کا دل اس سے اٹکا ہوا رہتا ہے تو وہ اس کا بھی دیوانہ اور محتاج بنا رہتا ہے، اور ان لوگوں کا بھی جن کے متعلق اس کو گمان ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کے حاصل کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔

فطرتِ انسانی کا یہ ایک عام اصول ہے۔ مال و زر، جاہ و دبدبہ، حسن و جمال، غرض جس شے کو بھی لو، ہر ایک کی تمنا میں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا۔ خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے کہ:-

فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهٗ (عنکبوت - ۲)	اللہ ہی کے پاس اپنا رزق تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرتے رہو۔

رزق کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں، ہر انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ کہیں نہ کہیں سے اس کو حاصل ہی کرنا پڑے گا، سو ایک شخص اللہ سے اپنا رزق مانگتا ہے تو وہ اللہ کا بندہ ہو گا، اور اسی کا محتاج اور اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے طلبِ رزق کرتا ہے تو دراصل اس مخلوق کا عبد ٹھیرا اور اسی کا حاجتمند۔

سوال کرنے کی ممانعت یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی مخلوق سے کچھ مانگنا اصولاً حرام اور ممنوع ہے اور محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ گدائی کی ممانعت میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں۔ مثلاً:-

(۱) جو لوگوں سے مانگتا رہے گا قیامت کے دن وہ اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ گوشت سے بالکل خالی ہو گا (یعنی نہایت ذلت و رسوائی

کے عالم میں) (بخاری و مسلم)

(۲) "جس شخص نے غنی ہونے کے باوجود (یعنی اپنے لیے سامانِ زیست رکھتے ہوئے) سوال کا ہاتھ اٹھایا، قیامت کے دن یہ سوال اس کے چہرے میں زخم کے گڑھے یا ہلکے یا اوچھے نشانات بن کر ظاہر ہوگا (یعنی سائل کے حالات اور کیفیت سوال کے لحاظ سے نشانہائے زخم زیادہ یا کم گہرے ہوں گے۔ اور ساری مخلوق کے سامنے اسے رسوا کریں گے) (ترمذی)

(۳) "سوال کرنا حرام ہے سوائے تین شخصوں کے۔ ایک تو وہ مقروض جو قرض کے بوجھ کے نیچے بری طرح پس رہا ہو، دوسرا وہ فقیر جس کو فقر و فاقہ کی شدت نے فرشِ خاک پر ڈال دیا ہو، تیسرا وہ خونی ملزم جس پر دیت کا بار ہمت شکن ہو رہا ہو" (ابوداؤد)

(۴) "قسم خدا کی، اگر تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر لائے اور بیچے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کی عزت نفس کو گدائی سے محفوظ رکھے، تو اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرے اور لوگ بھی اس کو دیں یا نہ دیں۔" (بخاری)

(۵) "جو سوال سے بچتا ہے اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے، جو عفت اختیار کرتا ہے اللہ اس کو عفیف بناتا ہے اور جو مصیبت پر صبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صابر بنا دیتا ہے۔ کسی شخص کو کوئی نعمت ایسی نہیں بخشی گئی جو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع ہو" (بخاری و مسلم)

(۶) "اس مال (خزانۂ بیت المال) میں سے اگر کچھ تمھیں ملے، اور تمھارا حال یہ ہو کہ نہ تو تم نے اس کو زبان سے مانگا ہو نہ ہی تمھارا دل اس کی طرف مائل ہو تو اس مال کو لے لو۔ اگر یہ صورت حال نہ ہو تو پھر اپنے نفس کو ایسے مال سے دور ہی رکھو۔"

گویا فی نفسہ اس مال میں کوئی پہلو کراہت کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق لینے والے کی نفسیات سے ہے۔ اگر دل اس کی حرص اور تمنا سے خالی ہے تو پھر چنداں مضائقہ نہیں، کیونکہ یہاں اس کی عبدیت کا جوہر بالکل محفوظ بچا رہتا ہے، اور اگر زبان سے سوال کر بیٹھا یا قلب کے کسی عمیق ترین گوشہ میں بھی اس مال کی خواہش دبی ہوئی ہے تو پھر ایک مومن کو ایسے مال کو ہاتھ لگانا روا نہیں کیونکہ یہاں اس کے جوہر عبدیت کی پامالی کا اندیشہ ہے۔

کبار صحابہ کو سوال کی قطعی ممانعت اوپر یہ تصریح گزر چکی ہے کہ اسلام کا مزاج سوال کرنے کو کبھی گوارا نہیں کرتا مگر بربنائے ضرورت مخصوص مجبوریوں کے موقع پر اس کی رخصت دی گئی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام نے اپنے خاص صحابہ کو اس رخصت سے بھی منع فرما دیا اور انھیں عزیمت کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے ہوئے حکم دیا کہ کسی مخلوق سے کبھی کوئی سوال نہ کریں۔ چنانچہ مسند میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تو وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ ذرا اسے اٹھا دینا اور فرماتے کہ میرے دوست نے مجھے حکم دیا ہے کہ انسانوں سے کوئی سوال نہ کروں۔" صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کے ساتھ نجد سے بیعت لی اور ہم سب کے کانوں میں آہستہ سے یہ بات ڈال دی کہ کسی سے کبھی کوئی سوال نہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا چھوٹ کر گر پڑتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتا کہ اسے اٹھا کر مجھے دو۔

خدا ہی سے سوال کرنے کا حکم ہے ایک دو نہیں بلکہ متعدد نصوص کتاب اور سنت میں موجود ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ مانگنا ہو رزاق حقیقی سے مانگو، کسی مخلوق کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۔ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ (الم نشرح) — پس جب تم فارغ ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب ہی سے التجا کرو۔

وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ (نساء۔۵) — اور اللہ سے اس کا فضل (رزق) مانگتے رہو۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ (عنکبوت۔۲) — اللہ ہی کے ہاں اپنا رزق چاہو۔

یہ آخری فقرہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ارشاد ہے۔ اس کے الفاظ کو دیکھو فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ فرمایا، فَابْتَغُوا الرِّزْقَ عِنْدَ اللّٰہ

نہیں کہا۔ کیونکہ عند اللہ کے الفاظ کو مقدم کر کے حصر اور اختصاص کا پہلو نمایاں کرنا مد نظر تھا گویا یوں فرمایا کہ رزق کسی غیر خدا کے یہاں ست تلاش کرو، بلکہ صرف خدا ہی کے دربار سے اس کو مانگو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس رضؓ کو نصیحت فرماتے ہیں:۔

"اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، اگر مدد چاہتی ہو تو اللہ سے چاہو"

ہر انسان بتقاضائے بشری دو چیزوں کا حاجتمند ہوتا ہے، ایک تو رزق وغیرہ ضروریات زندگی، دوسری حفاظت نفس اور دفع مضرت۔ ان دونوں امور میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے لیے انسان جب پکارے تو اللہ ہی کو پکارے۔ ضرورت کے وقت اسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور مصیبت کے موقع پر اسی سے فریاد کرے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام کا اسوہ ہمارے سامنے ہے کہ بیٹے کے غم کی شدت جب برداشت نہ ہو سکی اور وفور اضطراب میں لبہائے مبارک بے اختیار متحرک ہونے لگے تو ان سے جو صدا نکلی وہ یہ تھی کہ:۔

اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (یوسف) میں اپنی پریشانی اور رنج وغم کا گلہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے "ہجر جمیل" کو بطور اخلاق کی لیے کے ذکر فرمایا ہے۔ علماء نے ان الفاظ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ "ہجر جمیل" کے معنی ہیں کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر خاموشی کے ساتھ اس سے الگ ہوجانا۔ اور "صفح جمیل" کے معنی ہیں پیشانی پر آثار عتاب لائے بغیر کسی کو معاف کر دینا۔ اور "صبر جمیل" کے معنی ہیں زبان پر کسی مخلوق کے سامنے حرف شکایت لائے بغیر صبر کرنا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کو حالت مرض میں جب یہ سنایا گیا کہ امام طاؤس رضؓ مریض کے کراہنے کو مکروہ سمجھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ یہ شکوہ مخلوق ہے تو امام موصوف نے کراہنا موقوف کر دیا اور پھر اس کے بعد مرتے دم تک ان کے منہ سے آہ کا لفظ نہ سنا گیا۔

رہ گیا مصائب کے وقت حضرت باری تعالیٰ میں عرض شکایت کرنا، سو یہ صبر جمیل کے منافی نہیں، جس کی شہادت حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ سے ملتی ہے کہ ایک طرف آپ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ فرماتے ہیں اور ساتھ ہی اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ بھی کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز فجر میں سورہ یونس، یوسف اور نحل کی قرأت کرتے ہیں اور جب اس آیت (انما اشکوا لخ) پر پہنچتے ہیں تو رو پڑتے ہیں اور رونے کی آواز آخری صفوں تک سنائی دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"خدایا! حمد کا کلی استحقاق تجھی کو ہے، تو ہی ہماری شکایتوں کا مرجع ہے، تو ہی ہمارا سہارا ہے اور تو ہی ہمارا فریاد رس، تیرا ہی بھروسہ ہے اور جو قوت اور توانائی ہمیں ملتی ہے تیری جناب سے۔

طائف کے اشقیا نے جب رحمۃ للعالمین کے ساتھ اپنی مشہور اور رسوائے عالم درندگی کا مظاہرہ کیا تو زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے:۔

"اے اللہ! میں اپنی ناتوانی، اپنی بے چارگی اور اپنی کس مپرسی کا تجھی سے گلہ کرتا ہوں، تو ہی ناتوانوں کا پروردگار ہے، اور تو ہی میرا پروردگار، الخ

ان واقعات اور تفصیلات کی روشنی میں یہ حقیقت کسی بحث وتمحیص کی محتاج نہیں رہ جاتی کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی شکایتوں کو پیش کرنا اور اپنی مصیبتوں کے متعلق عرض ومعروض کرنا ممنوع اور مذموم نہیں بلکہ مامور اور ممدوح ہے اور جو بندہ اپنی حاجت براری کے لیے اللہ کے فضل وکرم

کا جتنا ہی زیادہ حریص ہوگا اس کی عبدیت اتنی ہی زیادہ پختہ اور خالص، اور ماسوا سے اس کی بے نیازی اتنی ہی زیادہ محکم اور کامل ہو گی۔ جس طرح کسی مخلوق کی حرص اور رغبت اس کی عبودیت کی موجب، اور اس سے مایوسی اور بے رغبتی اس سے قلب کی بے نیازی کی باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح خالق و رازق حقیقی کی نعمتوں اور نعمتوں کی حرص و رغبت اس کی عبودیت کی موجب ہے اور قلب انسانی کا اس کی طلب و احتیاج سے اعراض کرنا اس کی عبودیت سے اعراض کرنے کے مرادف ہے۔ یہ خطرہ ان لوگوں کے حق میں تو بہت زیادہ شدید ہے جو خالق کی طرف سے اپنی طلب و رجا کا رشتہ توڑ کر کسی مخلوق سے اس طرح جوڑ لیں کہ اسی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیں اور اسی پر اپنے اعتماد قلب کی عمارت تعمیر کر لیں مثلاً کوئی اپنی ریاست، اپنی حکومت، اپنی فوج اور اپنے خدم و حشم پر اعتماد کر بیٹھے یا کوئی اپنے اہل و عیال اور احباب و اقارب پر، یا اپنے ذخائر دولت پر اور خزائن سیم و زر کو اپنا مرجع التفات بنالے یا اپنے کسی آقا، کسی فرمانروا، کسی مخدوم، کسی پیر، کسی مرشد اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں کو، جو فنا ہو چکے ہوں یا جن کا فنا ہونا بہر حال یقینی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نصیحت اپنے ہر بندہ کے لیے یہ ہے کہ :۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ
وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا (فرقان - ۵)

اس اللہ پر بھروسہ کر جو زندہ جاوید ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔ اور اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کر، اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے کسی غیر کا ضرورتمند نہیں

اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس شخص کا دل بھی مخلوقات کی طرف اس توقع کے ساتھ مائل ہوگا کہ وہ اس کے کسی اڑے وقت میں کام دیں گی یا اسے روزی مہیا کریں گی یا اس کو راستی اور ہدایت عطا کریں گی۔ یقیناً اس کے دل میں ان کی عظمت پیدا ہوگی اور وہ ان کے سامنے عاجزانہ جھکا ہوا ہوگا اور انجام کار اسی اعتقاد اور اسی تذلل کے تناسب سے اس کے اندر ان کی عبدیت اور بندگی بھی ضرور پیدا ہو جائے گی اگرچہ بظاہر وہ ان کا امیر اور سردار اور آقا و فرمانروا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ حکیم کی نگاہ تو ظواہر پر نہیں ہوتی حقائق پر ہوتی ہے۔

حُبِّ غیر، بندگیٔ غیر ہے | چنانچہ جب کوئی شخص کسی عورت کے حسن و جمال سے متاثر ہو جاتا ہے تو، خواہ وہ عورت شرعاً اس کے لیے مباح ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل اس کا اسیر محض بنکر رہ جاتا ہے اور وہ جس طرح چاہتی ہے اس کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہتی ہے، حالانکہ ظاہر میں وہ اس کا آقا اور سردار ہوتا ہے کیونکہ اس کا شوہر ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کا محکوم اور مملوک ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت، جبکہ اس عورت کو بھی اس کے نیاز عشق اور فریفتگی شوق کا علم ہو جائے اور اسے یقین ہو جائے کہ کسی حال میں بھی اس کی مفارقت اس کو گوارا نہیں ہو سکتی اور خواہ کچھ ہی ہو جائے لیکن اس کو چھوڑنے اور کسی دوسری عورت سے رفاقت زندگی کا رشتہ جوڑنے کا تصور بھی اس کے لیے جانکاہ ہے۔ پھر تو وہ اس پر اس طرح آمرانہ حکومت کرتی ہے جس طرح کوئی ظالم اور قاہر آقا اپنے زرخرید اور مجبور محض غلام پر بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی اور مطلق العنانی کے ساتھ۔ کیونکہ روح کی قید، جسم کی قید سے اور روح کی غلامی، جسم کی غلامی سے کہیں زیادہ مستحکم ہوتی ہے، جس انسان کا بدن قید و بند غلامی میں ہو لیکن دل اس قید کے اثرات سے آزاد اور محفوظ رہے تو اس کو اس کی چنداں پروا نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات اس قید سے رہائی کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب سلطنت جسم کے بادشاہ ــــ قلب ــــ پر یہ آفت آجاتی ہے اور وہ کسی غیر اللہ کے دام قید یا حلقۂ غلامی میں جا پھنستا ہے تو پھر اس کی غلامی حقیقی غلامی ہوتی ہے اور یہ غلامی در اصل تذلل اور عبودیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اور قلب کی بندگی اور محکومی ہی وہ شے ہے جس پر ثواب اور عذاب کا ترتب ہوتا ہے۔ چنانچہ تمہیں معلوم ہوگا کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی کافر ظلماً قید کرے اور کوئی فاسق اس کو زبردستی غلام بنالے تو یہ چیز اس کے دین و ایمان کے حق میں کچھ بھی مضرت رساں نہیں بشرطیکہ اس قید اور غلامی میں بھی اپنی مقدرت کے مطابق وہ واجبات دینی ادا کرتا رہے۔ اسی طرح اگر مسلمان واقعۃً کسی کا غلام ہے اور وہ اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا رہتا ہے اور اپنے دنیوی آقا کے حقوق بھی، تو اس کے لیے اللہ کے ہاں دہرا اجر ہے۔ حدیث ہے کہ اگر کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں میں پڑ کر

کلمۂ کفر کہنے پر مجبور ہو جائے لیکن دل میں ایمان کا اقرار موجود ہو تو یہ ظاہری اقرار کفر اس کی سلامتی پر ایک سر مو بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بخلاف اس کے جس کا دل ہی کسی غیر مخلوق کا غلام بن جائے تو یہ اس کے ایمان کے لیے تباہ کن ہے۔ خواہ ظاہر میں وہ ایک سلطنت کا حکمراں ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ حریت اور عبودیت کا انحصار قلب پر ہے نہ کہ جسم پر۔ جس طرح کہ تونگری کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ مال سے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ غنا اور تونگری کا انحصار مال و دولت کی فراوانی پر نہیں ہے بلکہ دل پر ہے اور اصل تونگری دل کی تونگری ہے۔"

یاد رہے کہ یہ نتیجہ تو اس عشق کی نیاز مندیوں کا ہے جو شرعی طور پر کسی مباح صورت سے تعلق رکھتا ہو، اور اگر کہیں بدقسمتی سے کسی کا دل کسی خوبصورت یا کسی حسین لڑکے کی محبت میں غرق ہو گیا ہو اور وہ اس کے عشق کے آستانہ پر اپنی متاع قلب نثار کر دے تو پھر یہ وہ سراپا عذاب ہے جس کے اندر کسی خیر اور ثواب کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص ان بدبختوں میں ہے جو رحمت الٰہی سے سب سے زیادہ دور اور عذاب خداوندی سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ کسی حسین صورت کا عاشق جب تک اس حسین صورت کے تصور میں ڈوبا ہوا اور اس کا پرستار رہتا ہے، اس وقت تک وہ اور اس کے دل و دماغ، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے بے شمار مفاسد اور خبائث کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اس سلسلہ میں فاحشۂ کبریٰ کے ارتکاب سے بچا بھی رہے تو بھی صورت محبوب کے تصور میں اس کے قلب کا دائمی انہماک، بلا ارتکاب فاحشہ بھی، اس کے حق میں اس امر سے زیادہ ضرر ناک ہے کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ کر ڈالے اور پھر اس سے اس طرح تائب ہو جائے کہ قلب اس گناہ کے اثرات سے بالکل پاک ہو جائے۔ ایسے بوالہوسوں اور عاشقوں کا حال تو مستوں اور مجنونوں کا سا ہوتا ہے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر، کہ مجنون کو تو کبھی ہوش بھی آجاتا ہے مگر انہیں اپنے خمار عشق سے ایک لمحہ بھی رہائی نصیب نہیں ہوتی۔

غیر اللہ میں انہماک خدا سے تغافل

اس آفت روحانی کے سلسلہ کی سب سے بڑی اور آخری بدبختی یہ ہے کہ قلب اللہ کے ذکر اور فکر سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور حلاوت ایمانی کے احساس سے بالکل محروم۔ مگر انسان کا دل اخلاص ایمانی اور عبادت الٰہی کا لذت آشنا ہو تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے بھی اس سے شیریں تر، لذیذ تر اور مرغوب تر نہیں رہ جاتی کہ اس کی طرف وہ والہانہ رغبت کے ساتھ متوجہ ہو سکے کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی محبوب چیز کو اسی وقت چھوڑتا ہے جب اس کو کوئی اس سے زیادہ محبوب چیز میسر آجائے یا یہ کہ کسی بڑے نقصان اور مصیبت کا اس کو خوف ہو۔ پس حُبِّ فاسد سے قلب انسانی کو یا تو عشق صالح آزاد کرا سکتا ہے یا کوئی بڑا اندیشۂ زیاں۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے راز عفت کے متعلق فرماتا ہے:۔

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (یوسف - ۳)

ایسا ہوا تاکہ ہم یوسف کو برائی اور بے حیائی سے بچا لیں۔ یقیناً وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قلب مومن کو مبتلائے "سوء" ہونے سے ـــ یعنی حسن انسانی کی طرف کسی غیر مناسب طریقہ پر مائل ہونے اور اس کے دام میں گرفتار ہونے سے ـــ بچاتا ہے اور اس کے اخلاص ایمانی کے صدقہ میں "فحشاء" سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک انسان حقیقی ذوق اخلاص اور سچی لذت عبودیت سے شادکام نہیں ہوتا اس کا نفس اسے اپنی خواہشات کی چاکری میں لگائے رہتا ہے اور وہ اس کے سامنے بے بس بنا رہتا ہے مگر جب وہ ایک بار اخلاص کا لذت شناس ہو لیتا ہے اور اس کی قوتیں دل میں راسخ ہو جاتی ہیں تو بغیر کسی کشاکش کے خواہشات نفس اس کے آگے ہتھیار ٹیک دیتی ہیں۔ قرآن کے بیان کردہ فلسفۂ نماز میں ہمیں یہی اصول ملتا ہے:۔

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ

بلاشبہ نماز بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد سب سے بڑی

اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت - ۵)

چیز ہے (جو نماز سے حاصل ہوتی ہے)

یعنی نماز کی افادیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو مکروہات فطری ـــ یعنی فحشا اور منکر ـــ کا استیصال، دوسرے ایک شئے محبوب یعنی یاد الٰہی کا حصول۔ باعتبار مقصد دوسرا پہلو پہلے سے اہم اور افضل ہے کیونکہ اللہ جل شانہٗ کی یاد اور اس کی عبادت ہی مقصود بالذات ہے اور مکروہات کا اندفاع اس راہ کی ایک ناگزیر منزل اور اس کے حصول کا زینہ ہے، اس لیے اس کی حیثیت ثانوی اور تبعی ہوئی۔ قلبِ انسانی ایک ایسی مخلوق ہے جو طبعاً حق پسند اور حق طلب واقع ہوئی ہے، اس لیے جب برائی کا تصور اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اسے دور دھکیلنے کی سعی کرتا ہے کیونکہ برائیاں اور برے خیالات اس کو اس طرح تباہ اور برباد کر دیتے ہیں جس طرح خود رو گھاس پات زراعت کو۔ یہی حقیقت ہے جو ذیل کی آیات میں ہمیں ذہن نشین کرائی گئی ہے:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (والشمس)

بامراد ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو آلودہ کیا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (سبح اسم)

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے کو پاک کیا اور اپنے پروردگار کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (نور - ۴)

مومنوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریق کار ان کے لیے سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (نور - ۳)

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا۔

دیکھو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے "غض بصر" اور "حفظ فروج" کو نفس کے لیے "ازکیٰ" یعنی پاکیزہ قرار دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ ترکِ فواحش پاکی نفس کا ایک بنیادی جزء ہے۔ اور پاکی نفس ایسا جامع لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس تمام برائیوں سے ـــ مثلاً فواحش، مظالم، جھوٹ اور شرک وغیرہ سے پاک اور بے لوث ہو جائے۔

یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو کسی حکومت کا طالب ہوتا ہے اور زمین پر اپنی فرمانروائی اور سرداری اور کبریائی کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ اندر سے دیکھو تو وہ بھی اپنے معینوں اور مددگاروں کا غلام نظر آئے گا گرچہ ظاہر میں وہ ان کا رئیس اور مطاع دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنے اوپر آقائی اور حکمرانی اور آمریت کی جو نقاب ڈال رکھی ہے اس کے نیچے دراصل وہ دل ہے جو اپنے اتباع اور اعوان و انصار کے خوف و رجا سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھولے رکھتا ہے، بڑی بڑی جاگیریں بخشتا رہتا ہے اور ان کی کتنی ہی لغزشیں دیکھتا ہے مگر چشم پوشی کر جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے تاکہ وہ اس کی اطاعت اور اعانت کے لیے تیار رہیں، اور اس کے حسب منشا جدوجہد کرنے سے دریغ نہ کریں، ورنہ لیلائے حکومت کی تمنا حسرت ہی بن کر رہ جائے گی۔ پس ظاہر میں وہ ان کا آقا اور مطاع ہے پر حقیقت میں وہ خود ہی ان کا مطیع اور غلام ہے۔

لیکن ذرا اور گہری نظر سے دیکھو تو محسوس ہوگا کہ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہیں اور ہر ایک کے اندر دوسرے کی عبودیت موجود ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کا اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے۔ اس لیے یہ سب کے سب عبادت الٰہی کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ اور اگر ان دونوں کا مذکورہ تعاون، خدا کی زمین پر ظالمانہ طور پر علو اور تمکن حاصل کرنے کے لیے ہو تو ان کی حیثیت ان دو بدباطنوں کی سی ہو جاتی ہے جو کسی بدمعاشی یا رہزنی میں ایک دوسرے کی امداد کریں۔ الغرض ہوائے نفسی اور اغراض نفسانی ہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس فرمانروا کو

اپنے نام کے فرمانبرداروں کا، اور ان فرمانبرداروں کو اس نام نہاد فرمانروا کا عبد اور غلام بنا رکھا ہے۔
مال و دولت کا حریص بھی اسی صورت حال کا اسیر ہوتا ہے۔ اگر عاشقِ صورت، حسن صورت کا، اور طالب ریاست اپنے سپاہیوں اور سپہ سالاروں کا پرستار ہے تو یہ اپنی زندگی مال و زر کی عبودیت اور پرستش میں نذر کرتا ہے۔

اشیاءِ مادی کی دو قسمیں

اس تنقیح سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ امورِ مادی اور اشیائے دنیوی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کی احتیاج انسان فطری طور پر رکھتا ہے مثلاً کھانا، پانی، لباس، مکان، بیوی وغیرہ۔ سو ان چیزوں کے حصول میں بندۂ مومن کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں اللہ ہی سے مانگتا ہے اور ان کے لیے اللہ ہی کے حضور رجوع کرتا ہے۔ اور وہ مال و اسباب جن سے وہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کام لیتا ہے، ان کی حیثیت اس کے نزدیک اس گھوڑے یا گدھے سے جس پر وہ سوار ہوا کرتا ہے، یا اس فرش سے جس پر وہ بیٹھا کرتا ہے، بلکہ اس قدمچہ سے بھی، جس پر وہ بیٹھ کر رفع حاجت کرتا ہے، زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اسباب زندگی اس کو ایسا گرویدہ نہیں بنا لیتے کہ وہ بس انھیں کا ہو رہے اور اس پر اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا کی کیفیت طاری ہو جائے۔

دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کی ضرورت، انسانی زندگی کے لیے فطری نہیں۔ ایسی چیزوں کی فکر اور تمنا میں سرگرداں ہونا ایک بندۂ خدا کا شیوہ نہیں۔ اور اگر ان چیزوں سے وہ دلی وابستگی پیدا کرے گا تو یقیناً وہ اس کو اپنا غلام بنا لیں گی اور بسا اوقات ایسا ہوگا کہ وہ ان کے لیے غیر اللہ پر اعتماد کرنے لگے گا، جس کے بعد قلب میں حقیقی عبودیت اور توکل علی اللہ کا وجود ایک امر ناممکن ہے، بلکہ صاف صاف یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اندر غیر اللہ کی عبدیت اور غیر اللہ پر توکل، اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا آدمی ارشادِ نبوی تعس عبد الدرہم الخ کا اولین مصداق ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ انھیں درہم و دینار اور دوسرے زخرفات دنیوی کا بندہ ہو رہتا ہے خواہ وہ ان چیزوں کو اللہ ہی سے کیوں نہ مانگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے باوجود وہ اس کے فیصلوں پر صابر اور شاکر نہیں رہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی سعی کر دے تب تو خوش، اور اگر نہ کرے تو ناخوش۔ کیا اللہ کی بندگی کے یہی معنی ہیں؟ اللہ کا بندہ تو وہ ہوتا ہے جو اس چیز سے خوش ہوتا ہے جس سے اللہ خوش ہو اور اس چیز سے بیزار ہوتا ہے جس سے اللہ بیزار ہو۔ اس شے کو پسند کرتا ہے جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ پسند کرتے ہوں اور اس شے سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ اور رسول نفرت کرتے ہوں۔ اللہ کے دوستوں کو دوست رکھتا ہے اور اس کے دشمنوں کو دشمن۔ ایسا ہی شخص ایمان کامل کی دولت سے بہرہ ور ہے۔ جیسا کہ ایمان کے معلم اور ہادی کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں پر اس کی وضاحت فرمائی ہے:۔

"جس نے اللہ ہی کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اللہ ہی کے لیے خرچ کیا اور اللہ ہی کے لیے (خرچ کرنے) سے رک رہا، اس نے ایمان کی پوری دولت حاصل کرلی۔"

"ایمان کا سب سے مضبوط وسیلہ حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔"

"تین چیزیں جس کے اندر ہوں گی وہی ایمان کی حلاوت اور لذت پائے گا (۱) اللہ اور اس کا رسول ساری کائنات سے زیادہ اس کو محبوب ہوں۔ (۲) جس سے بھی محبت رکھے صرف اللہ ہی کے لیے رکھے۔ (۳) کفر سے نکل آنے کے بعد اس کی طرف لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا آگ میں پڑنے کو ناپسند کرتا ہے۔"

جب کوئی شخص ایمان کی اس منزل پر پہنچ لے گا، تب ہی وہ اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدم رضا کے ماتحت کر سکے گا اور اسی وقت کون و مکان کی ہر شے سے بڑھکر اللہ اور رسول اس کی نگاہوں میں عزیز ہوں گے اور مخلوق کی محبت اگر وہ کرے گا تو محض خدا کے لیے نہ کسی دوسری غرض سے۔ اس طرح اس کی یہ محبت خلق بھی محبت خداہی کا تقاضا بلکہ اس کا ایک تکمیلی پہلو ہوگی۔ کیونکہ عشق کا اصول ہی یہ ہے کہ "ندیم دوست" سے بھی "بوئے دوست" آتی ہے، اور محبوب کے محبوب کی محبت، کمال محبت کی نشانی ہے۔

حب رسول کی حقیقت یہیں سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اولیاء کی محبت کی حقیقت کا بھی سراغ مل جاتا ہے۔ ایک شخص جو ان برگزیدہ بندوں کی محبت اس لیے، اور محض اسی لیے کرتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے پسندیدہ طریقوں کے رہبر اور رہنما ہیں، تو گویا اس نے ان کی محبت خداہی کے لیے کی، نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے۔ قرآن مجید کہتا ہے:۔

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ - ۸)

تو عنقریب اللہ تعالیٰ کچھ دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اس کو محبت ہوگی اور جن کو اس سے محبت ہوگی۔ مومنوں کے لیے بالکل نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ مومنوں اور خدا پرستوں سے نرمی، اخوت اور محبت کے ساتھ پیش آنا محبت خداوندی ہی کا لازمہ اور اسی کا فطری اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران - ۴)

اے نبی لوگوں سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اور یہ اس لیے کہ نبی ان کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے، نیز خود انھیں کاموں کو کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور ان کاموں سے روکتا ہے اور خود بھی رکتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہیں اور ایسی حقیقتوں کی خبر دیتا ہے جن سے بنی نوع انسان کا باخبر ہونا اور جن کو ماننا اللہ کو محبوب و مطلوب ہے۔ اس لیے جو محب خدا ہونے کا ادعا رکھتا ہو، اس کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ رسول خدا کا اتباع کرے۔ اس نے غیب و شہود کی جن حقیقتوں کی خبر دی ہو، ان کی تصدیق کرے۔ اس کے ایک ایک حکم کے سامنے بخوشی سر تسلیم و طاعت خم کردے اور میدان زندگی میں اپنا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے رسول کا نقش قدم دیکھ لے۔ جس نے ایسا کیا وہ محبت الٰہی کے دعوی میں سچا اور امتحان میں کامیاب رہا اور انجام کار خدا کی محبوبیت کے شرف سے سرفراز۔

محبت الٰہی کی دو علامتیں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو اپنی محبت کا نشان قرار دیا ہے، اتباع رسول اور جہاد فی سبیل اللہ ۔۔ جہاد فی سبیل اللہ یعنی خدا کی محبوب چیزوں ۔۔ ایمان اور عمل صالح ۔۔ کے حاصل کرنے میں، اور خدا کی ناپسندیدہ چیزوں ۔۔ یعنی کفر و فسق اور تمرد و عصیان ۔۔ کے مٹا ڈالنے میں اپنی ساری قوتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنا ۔۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ - ۳)

اے نبی ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمھارے ماں باپ، بیٹے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان، تمھارے وہ اموال جنھیں تم نے کما رکھا ہے تمھاری وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے کا تمھیں کھٹکا لگا رہتا ہے، اور تمھارے دل پسند مکانات تمھاری نگاہوں میں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب (اور قیمتی) ہیں تو پھر ٹھیرو کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کرے۔

غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو کتنی ہیبتناک وعید سنائی ہے جو اللہ اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں اپنے اہل اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ احادیث میں تو بالکل کھلا ہوا مطالبہ موجود ہے کہ:۔

"قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نظروں میں اس کے بیٹے اور اس کے باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے عرض کیا کہ:۔

"یا رسول اللہ! آپ، مجھے اپنی جان کے سوا باقی ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔"

ارشاد ہوا کہ:۔

"نہیں اے عمر! (ایمان کے حقیقی حامل تم نہیں ہو سکتے) تاوقتیکہ میں تمہیں، تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کی فضائے قلب میں ایک برقی انقلاب سا ہوا، پکار اٹھے "خدا گواہ ہے کہ آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔" فرمایا "ہاں! اب اے عمر!"

پس کمال محبت حاصل کرنے کے لیے محبوب سے کامل موالات کا جذبۂ صادق پیدا کرنا ضروری ہے۔ "کامل موالات" کا مطلب یا اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی پسند اور ناپسندیدگی اور اپنی محبت اور عداوت کو محبوب کی محبت و عداوت کے ماتحت کر دیا جائے۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ محبوب حقیقی ــــ اللہ تعالیٰ ــــ کی پسندیدہ چیزیں، ایمان اور تقویٰ ہیں اور ناپسندیدہ چیزیں فسق اور عصیان ــــ نیز یہ ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے کہ محبت قلب انسانی کا ایک زبردست محرک ہے۔ جب کبھی وہ انسان کے دل میں رسوخ حاصل کرتی ہے تو اس کو اپنی محبوب چیز کے حاصل کرنے پر ابھارتی رہتی ہے۔ اگر محبت، حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے تو محبوب کے حصول کا ارادہ بھی عزم اور حزم کی آخری بلندی پر ہوگا۔ اب اگر بندہ باعتبار اسباب و ذرائع اس پر قادر ہو سکتا ہے تو اس کو حاصل کیے بغیر دم نہ لے گا۔ اور اگر عجز و درماندگی اس کی راہ روک لیتی ہیں اور اپنی انتہائی کاوش کے باوجود اسے حاصل کرنے سے مجبور اور معذور ہو جاتا ہے تو بھی اس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا عملاً کامیاب ہو جانے والے اور اس کو کر گذرنے والے کے لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

"جس شخص نے ہدایت کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس ہدایت کے ماننے والوں کو ملے گا، اور یہ ان کے اجر میں بغیر کسی کمی کے ہوگا۔ اسی طرح جس نے لوگوں کو گمراہی کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی عذاب ہوگا جتنا اس کا اتباع کرنے والوں پر، اور ایسا ان پیروکاروں کے عذابوں میں بغیر کسی تخفیف کے ہوگا۔"

جہاد میں تمنائے شدید رکھنے کے باوجود جو لوگ حصہ لینے سے کسی نہ کسی بنا پر معذور رہتے۔ ان کے متعلق فرمایا:۔

"مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو ہر میدان اور ہر وادی میں، جس کو تم نے اپنی مجاہدانہ تگ و دو میں طے کیا، تمہارے ہم رکاب تھے۔"

صحابہ نے پوچھا "کیا مدینہ میں رہتے ہوئے بھی (وہ ہمارے ساتھ تھے)؟" جواب دیا "مدینہ میں رہتے ہوئے بھی، عذر نے انھیں روک رکھا تھا۔"

جہاد کی حقیقت

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ جہاد نام ہے حق تعالیٰ کی محبوب چیزوں کے حاصل اور برپا کرنے اور اس کی مبغوض و ناپسندیدہ چیزوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی تمام طاقتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنے کا۔

حُبّ رسول اور محبت الٰہی کا معیار پس جہاد ہی دراصل وہ کسوٹی ہے جس پر ہر بندۂ الٰہی کا دعوائے حُبّ الٰہی کس کر پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر بندہ طاقت اور قدرت رکھنے کے باوجود، اپنی طاقت کے مطابق، فریضۂ جہاد بجا نہیں لاتا، تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ اس کی محبت اپنے اندر کوئی مضبوط روح نہیں رکھتی۔ بندہ اس فرض کی ادائگی میں اپنی استطاعت کے لحاظ سے جتنی سستی اور بے توجہی دکھائے گا اتنا ہی اپنی محبت کے کھوکھلے پن کا زبان حال سے اقرار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فرض کی بجاآوری کا راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے، لیکن محبت کی اس سنت کو کون نہیں جانتا کہ محبوب تک رسائی اور باریابی عموماً خطرات اور مصائب اٹھانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ محبت صالحہ کی بھی یہی سنت ہے اور یہی محبت فاسدہ کی بھی۔ حکومت کا شیدائی تخت حکومت کو، دولت کا پرستار خزانۂ دولت کو، حسن صورت کا دیوانہ وصال محبوب کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک، اس عالم میں پیش آجانے والے عذاب شدید کے علاوہ، اِس دنیا میں بھی ہولناک مصیبتوں سے دوچار نہ ہولے۔ اس لیے اگر اللہ اور رسول کا محب ان کی محبت کی راہ میں اتنی جانبازی بھی نہ دکھائے جو غیراللہ سے محبت رکھنے والوں میں سے ایک صاحب عقل و عزیمت اپنے محبوب کی خاطر دکھاتا ہے، تو یقیناً وہ اپنی محبت کی کمزوری اور سطحیت کی ایک ناقابل تردید دلیل دیتا ہے، حالانکہ مومن کی نمایاں صفت یہ ہے کہ ساری کائنات سے زیادہ اس کو اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ-۲۰) اور جو اہل ایمان ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

ہاں! ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ محبت میں صرف جوش اور خلوص ہی منزل مقصود تک پہنچنے کی ضمانت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ساتھ عقل اور ہوش کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ محب صادق، سچی محبت رکھنے کے باوجود، اپنی عقل کی کمی، نظر کی کوتاہی اور تصور کی نارستی کے باعث ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچتا۔ اور ایسی راہ تو اس وقت بھی مذموم ہوتی ہے جب کہ محبت صالح ہو۔ اور اگر محبت فاسدہ میں کوئی اس طرح کی راہ اختیار کرے تو پھر اس کی محرومی کا کیا پوچھنا جیسا کہ حکومت، دولت اور صورت کے بعض اندھے دیوانے کیا کرتے ہیں۔ ایک تو ان کی محبت کا رخ ہی غلط ہوتا ہے، دوسرے اس کے حصول میں عقل و خرد کی تمام ہدایتوں سے آزاد ہو جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کچھ نہیں لگتا، البتہ طرح طرح کی مصیبتیں اور خواریاں انھیں اپنی آماجگاہ ضرور بنا لیتی ہیں۔ پس راہ محبت میں سررشتۂ عقل کا دامن ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، ورنہ کامیابی سراب ثابت ہوگی۔

(باقی)

ہماری تازہ مطبوعات

What is Islam? (اسلام کیا ہے؟ بزبان انگریزی) از جناب مظہر الدین صاحب صدیقی قیمت عہ

اس کتاب میں ۹ مختلف ابواب میں مندرجہ ذیل مسائل پر بحث کی گئی ہے:-

(۱) مذہب کی ضرورت کیا ہے؟ (۲) اسلام کیلیے دوسرے مذاہب پر وجہ ترجیح کیا ہے؟ (۳) اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟ (۴) ابتدائی ارکان اسلام کیا ہیں (۵) اسلام کا سیاسی اور اخلاقی نصب العین کیا ہے؟ (۶) اسلام کا نظام معاشی کیا ہے؟ (۷) عائلی زندگی اور عورت کی حیثیت (۸) غیر مسلم سے تعلقات (۹) موجودہ مسلم زوال میں کس چیز کو دخل ہے۔